



فہرست

ادب و مزاح

۱. بے چین.....

بچوں کی دنیا

۲. بھوت.....

۵. ترقی.....

۶. تین دوست.....

سائنس / ٹیکنالوجی

۸. ہائی ٹیک.....

معاشرہ اور ثقافت

۱۰. بہتر گھر.....

بے چین

مصنف: یوسف

میکوشن نے سامنے بیٹھے امیدوار کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دہلا پتلا گندی رنگت کا آدمی کام کی تلاش میں آیا تھا۔ میکوشن نے اُسے بتایا کہ یہ کام بہت مشقت والا اور عارضی ہے تمہیں نقد ادائیگی کی جائے گی۔ یہ پرانی عمارتیں گرانے کا کام ہے جس میں خطرہ بھی ہے لیکن بیمہ یا صحت کے علاج کے سلسلے میں مامری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔



رام لعل نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا تعلق بھارتی علاقے راجستھان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ وہ طب کی تعلیم پانے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس کا آخری سال تھا، اپنی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اُسے مزید آمدن درکار تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیکیدار کے دفتر عارضی ملازمت حاصل کرنے آیا تاکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کچھ آمدن حاصل کر سکے۔ میکوشن نے رام لعل سے کہا، وہ کل سے کام پر جائے۔ اوقات صبح ۷ بجے سے شام کے ۷ بجے ہیں۔ تمام مزدوروں کو ٹرک صبح ۶ بجے اسٹیشن کے سامنے سے لیتا ہے۔ ان کا انچارج بل کیمرون ہے، میں اسے بتا دوں گا۔ رام لعل دفتر سے باہر آیا اور ایک کرا تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے بعد اسے اسٹیشن کے قریب ایک کرا مل گیا۔ اتوار کے روز وہ اپنے مختصر سلمان کے ساتھ اس کمرے میں مستقل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت وہ بستر پر لیٹا اپنے گانوں کی پہاڑیوں، کیمپوں اور کسانوں کو پکارتا اور سوچتا رہا تھا کہ جلد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن کر گانوں چلا جائے گا۔ پیر کی صبح رام لعل جلدی اٹھا اور ۶ بجے کے قریب مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک پہنچ گیا۔ اس وقت تک ۱۲ افراد جمع ہو چکے تھے۔ رام لعل کچھ دور بٹ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں گروپ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس کے پاس مزدوروں کی فہرست تھی اور وہ سب کو جانتا تھا۔ رام لعل اُس کے قریب پہنچا تو فورمین نے پوچھا ”کیا تم وہی کالے آدمی ہو جسے میکوشن نے ملازم رکھا ہے۔“ اس نے کہا ”ہاں میں ہی ہری کشن رام لعل ہوں۔“ فورمین بل کیمرون کا رویہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ اس کا قد ۶ فٹ ۳ انچ اور جسم طاقتور تھا، شکل سے

بھی وہ ایک پہلوان معلوم ہوتا۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس نے عمارت سے زمین پر تھوکا اور رام لعل سے کہا ”جانو ٹرک میں بیٹھو۔“ دوران سفر ایک شخص نے پوچھا ”تم کہاں سے آئے ہو۔“ اس نے کہا ”بھارت کے علاقے راجستھان سے۔“ آدمی نے پوچھا ”کیا تم سیمائی ہو؟“ رام لعل نے کہا ”میں ہندو ہوں۔“ اس شخص نے پھر جس کا نام برنس تھا، باقی لوگوں سے رام لعل کا تعارف کرایا۔ ایک شخص نے کہا ”تمہارے پاس کھانا نہیں ہے؟“ رام لعل نے کہا ”میں کل سے لاؤں گا۔“ دوسرے شخص نے پوچھا ”کیا تم نے ایسا مشقتی کام پہلے کیا ہے؟“ رام نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس شخص نے کہا ”تمہیں مضبوط جوتے اور دستاں بھی خریدنے ہوں گے۔“ باتوں باتوں میں رام لعل نے بتایا کہ وہ طب کا طالب علم ہے اور اسے مجبوراً یہ کام کرنا پڑا ہے تاکہ کچھ زائد آمدن حاصل کر سکے۔ ٹرک ڈویڈ روڈ پر ایک کچے راستے پر درختوں کے قریب رک گیا۔ وہاں کوہرے کنارے شراب کی ایک پرانی ٹینکری تھی جسے گریا جاتا تھا۔ عمارت کے مالک کی خواہش تھی کہ کم سے کم رقم خرچ ہو۔ لہذا اس نے کسی بڑی کینن کے بجائے ٹھیکیدار میکوشن سے بات کی جو مناسب رقم میں بغیر مشینری کے عمارت گرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میکوشن کے مزدوروں نے یہ کام بھاری ہتھوڑوں اور کدالوں کی مدد سے کرنا تھا۔ میکوشن کو یہ بھی لالچ تھا کہ عمارت ٹوٹنے سے نکلنے والی لکڑی اور ٹیکڑوں ٹن اینٹیں فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل ہوگی۔ مزدور اوزار اٹھائے عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس بڑے ہتھوڑے، لمبی چھینیاں اور رے تھے۔ فورمین نے کہا ”چلو ابھی کام شروع کرو۔ ہم سب سے پہلے چھت کی ٹائلیں توڑیں گے۔“ رام لعل نے اندر چھت دیکھی جو کسی چار منزلہ عمارت کے برابر اونچی تھی۔ اسے اونچائی سے خوف آتا تھا۔ ایک آدمی نے پرانی لکڑی کا دروازہ توڑا اور آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ سب لوگوں نے تام چینی کے گک نکالے اور چائے پیئے۔ رام لعل نے سوچا کہ کل وہ گک بھی خرید لے گا۔ تاہم برنس نے اپنے گک میں رام لعل کو چائے دی۔ چھت پر کام شروع ہو گیا۔ ٹائلیں اکھاڑ کے نیچے پھینکی جانے لگیں۔ ۱۲ بجے کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا اور سب لوگ پیچھے آگئے۔ چائے پنی اور رام لعل کے سوا سب مزدوروں نے کھانا کھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو جگہ جگہ سے چھل گئے تھے اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ برنس نے رام لعل سے کہا ”لو تم بھی سینڈوچ کھا لو، میرے پاس کافی ہیں۔“ بل کیمرون سامنے بیٹھا تھا، اس نے برنس سے کہا ”تم کیا کر رہے ہو۔ کالے کو اپنا کھانا خود لانے دو، تم صرف اپنی فکر رکھو۔“ برنس نے اپنی نظریں جھکائیں کیونکہ کوئی بھی فورمین کے آگے نہیں بول سکتا تھا۔ پورے پختے کام چلتا رہا۔ عمارت کی چھت، دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں نیچے لیے کے ڈھیر پر گرتی رہیں۔ رام لعل کے لیے یہ سخت محنت کا کام تھا، ہاتھ زخمی ہو گئے

لیکن رقم کی خاطر وہ محنت کرتا رہا۔ اس دوران فورمین بل کیمرون جسے لوگ ”جگ بل“ بھی کہتے تھے، رام لعل کے پیچھے لگا رہا۔ مشکل سے مشکل کام اسے دیا جاتا تھا وہ بے عزتی کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ پختے کے روز تک اندر کا کام پورا ہو چکا۔ اب باہر کی دیواریں باقی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیواروں میں نیچے ڈانکھٹ لگایا جاتا تو ایک ساتھ پورا ملے نیچے آ گرتا۔ لیکن میکوشن کے لیے یہ طریقہ ناقابل عمل تھا۔ اس کے لیے لائنس کی ضرورت تھی جو شمالی آئرلینڈ میں مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ محکمہ ٹیکس اور انشورنس والوں کو بھی ادائیگی کرنا پڑتی۔ لہذا یہ سارا کام مزدوروں کے ہاتھوں رہا ہوا تھا۔ خود کو خطرہ میں ڈالنے دیواریں ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔ کھانے کے وقت فورمین نے اوپر کوہر گھوم کر کام کا جائزہ لیا اور پھر کہا کہ اس طرف کی دیوار کا بڑا حصہ پہلے توڑنا ہے۔ پھر وہ رام لعل کی طرف مڑا اور کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم اوپر چڑھو اور جب دیوار گرنے لگے تو اسے باہر کی طرف دھکا دو۔“ بل کیمرون جانتا تھا کہ رام لعل اونچائی سے ڈرتا ہے۔ رام لعل نے جواب دیا ”اس پوری دیوار میں دروازہ پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اوپر گیا، وہ اس کے ساتھ ہی گرسے گا۔“ بل کیمرون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ چیخ کر بولا ”تم مجھے میرا کام مت سمجھاؤ۔ کالے آدمی، جیسا تم سے کہا، وہی کرو۔“ رام لعل اٹھا اور فورمین کے سامنے جا کر بولا۔ ”مسٹر کیمرون! ایک بات صاف ہوئی چاہیے۔ میرا تعلق راجپوت قبائل سے ہے۔ گو اس وقت میرے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے رقم کم ہے لیکن میرے آبا ء و اجداد میں دو ہزار سال قبل راجہ، مہاراجہ، شہزادے اور فوج کے سپہ سالار گزرے ہیں۔ اس وقت تم لوگ ہندوں کی طرح چادروں ہاتھ پیر پر چلنے اور کپڑوں کی جگہ کھال پہنتے تھے۔ براہ مہربانی آپ میری بے عزتی کرنا بند کر دیں۔ ہر انسان کی اپنی عزت ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔“ رام لعل کی یہ مختصر تقریر سب لوگوں نے دم بخود سی۔ بل کیمرون کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر گالی دی اور کہا ”ہمچا تو تم واقعی عزت دار تھے۔“ ساتھ ہی اس نے رام لعل کے منہ پر اٹلے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پتھارا رام لعل زمین سے اڑ کر کئی فٹ دور جا گر۔ برنس کی آواز آئی ”لوگے زمین سے اٹھنا مت، ورنہ جگ بلی تمہیں جان سے ہی مار دے گا۔“ رام لعل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیوڑوں بل کیمرون مٹھیاں بند کئے اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ رام لعل کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے پڑا رہا۔ ڈھک اور بے عزتی کی تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بند آنکھوں سے رام نے خود کو وطن میں پایا جہاں اس کے آبا ء و اجداد گھوڑوں پر سوار، تلوار اور نیزوں سے لیس آس پاس سے گزرتے اسے صرف ایک لفظ کہہ رہے تھے ”انتقام، انتقام۔ تمہیں اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہوگا۔“

کیمرن کی جیکٹ کی داہنی جیب میں الٹا اور فوراً واپس آکر کام میں لگ گیا۔ کھانے کے دوران سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر سیڑھج کھانے لگے۔ رام لعل کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا، وہ زبردستی سب کے ساتھ بیٹھا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر فورمین کی جیکٹ کی طرف دیکھتا۔ آخرکار بل کیمرن نے کھانا ختم کیا، اچھ کر اپنی جیکٹ کی طرف گیا اور داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔



چند سیکنڈ بعد اس نے پائپ اور تباکو کی تھیلی نکالی، پائپ بھر کر جلا یا اور بیٹا شروع کر دیا۔ رام لعل مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا کہ اس کی چال نے اپنا کام نہیں دکھایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے جیکٹ کی طرف دیکھا۔ اسے چند سیکنڈ کے لیے جیکٹ کے ایک کنارے پر کوئی چیز چلتی نظر آئی۔ جیکٹ کی جیب میں پائے جانے والے چھوٹے سے سوراخ سے سانپ نکل کر اندرونی سلائی میں چھپ گیا تھا۔ شام کو واپسی کے وقت فورمین نے اپنی جیکٹ اتار کر اپنے برابر رکھ لی اور مقررہ مقام پر سب لوگ اتر کر اپنے گھر جانے لگے۔ رام لعل نے برنس سے پوچھا کہ کیا بل کیمرن کے بیوی بچے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ رام لعل اپنے کمرے پہنچا اور دل سے دعا کرنے لگا کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ بل کیمرن سے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانا میرا مقصد ہرگز نہیں۔ اتوار کا دن بھی انہی سوچوں میں گزر گیا۔ پیر کی صبح بل کیمرن اور اس کے بیوی بچے صبح ۶ بجے کے قریب اٹھے اور ناشتا کرنے باورچی خانے میں جمع ہو گئے۔ بل کیمرن کام پہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ ذرا میری جیکٹ

بٹھے واپس آ سکتا ہوں۔“ ٹھیکیدار نرم دل آدمی تھا، اس نے کہا ”ٹھیک ہے! تم جانتے ہو۔ اگر تم وعدے کے مطابق واپس پہنچ جاتے ہو تو انہی شرائط پر دوبارہ کام شروع کردیتا۔“ رام لعل نے ٹھکریہ ادا کیا اور واپس آگیا۔ اگلے روز اس نے اپنے سکھ دوست سے رقم احوار لی اور بذریعہ ریل لندن پہنچ کر بھارت جانے کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ اس طرح ۳۳ گھنٹوں کے اندر وہ بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک دکان پر پہنچا جہاں پلاٹو پرندے، سانپ اور دیگر جانور فروخت ہوتے تھے۔ اُسے دراصل ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔ دکاندار نے بتایا کہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ کل ہی میرے پاس ایک چھوٹا سانپ آیا ہے جو آراکھیرانگ (Saw Scaled Viper) کہلاتا ہے۔ یہ سانپ مغربی افریقہ سے عرب، ایران، پاکستان اور بھارت کے خشک اور نرم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰-۱۵ سینٹی میٹر تک، رنگ گہرا بھورا اور جسم پتلا ہوتا ہے۔ زہریلے دانت شکار کی جلد پر سوئی جیسے دو سوراخ چھوڑتے ہیں۔ زہر اتنا تیز اثر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت کا سبب دماغ میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔ رام لعل نے دکان کے مالک سے پوچھا کہ اس سانپ کی کیا قیمت لوگے؟ کچھ دیر بحث کے بعد سووا ۳۵۰ روپے میں ملے ہو گیا۔ رام لعل سانپ کو ایک ڈسکن والی بوتل میں بند کر کے گھر پلا آیا۔ لندن سفر کے لیے رام لعل نے ایک سگار بکس خریدا۔ اسے خالی کر کے اس میں پندرہ چھوٹے سوراخ کیے اور سانپ نرم پتوں کے ساتھ سگار بکس میں بند کر کے اسے اچھی طرح ٹیپ سے بند کر دیا۔ اس طرح لندن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ شام تک رام لعل اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے سگار بکس نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل صحیح حالت میں سیاہ چمک دار آنکھوں سے رام لعل کو گھور رہا تھا۔ رام لعل نے شیشے کا ایک ڈسکن دار مرتبان خالی کیا تاکہ صبح استعمال کیا جائے۔ صبح جلدی اٹھ کر اس نے انتہائی احتیاط سے سانپ کو سگار بکس سے مرتبان میں منتقل کیا۔ مضبوطی سے ڈسکن لگایا اور اسے اپنے لٹچ بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔ مقررہ وقت وہ اسٹیشن پہنچا جہاں سے ٹرک سب مزدوروں کو لیے کام کی جگہ جاتا تھا۔ بل کیمرن کی یہ عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی جیکٹ اتار کر کسی شاخ پہ تھار دیتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ جیکٹ کی جیب سے اپنا پائپ اور تباکو کی تھیلی نکال کر پائپ ضرور پیتا۔ رام لعل کا ارادہ تھا کہ وہ موقع پا کر سانپ کو بل کیمرن کی جیکٹ کی جیب میں چھوڑ دے گا۔ پھر وہ جیکٹ کی جیب سے پائپ اور تباکو نکالے گا۔ اس دوران سانپ بل کیمرن کو ڈس لے گا۔ بل کیمرن گھبرا کر ہاتھ جیب سے نکالے گا، تو سانپ اس کے ہاتھ سے لٹکا ہوگا کیونکہ اس کے دانت گوشت میں گڑے ہوں گے۔ منصوبے کے مطابق رام لعل کسی بہانے ۱۱ بجے کے قریب اٹھا۔ اپنا لٹچ بکس کھول کر سانپ کا مرتبان نکالا، ڈسکن کھول کر بل

رام لعل خاموشی سے اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ سارا دن نہ وہ کسی سے بولا اور نہ کوئی بات کی۔ اس رات جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو باہر گرج چمک ہو رہی تھی اور طوفانی بارش کے آثار تھے۔ وہ بسز پر لپٹ گیا اور کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے انتقام لے سکے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہونے لگی۔ اس کی نظر کھڑکی کے شیشے پر پڑی جہاں بارش کی بوندیں ایک قطار کی شکل میں بننے لگی تھیں۔ شیشے پر پڑی مٹی کی وجہ سے پانی کی قطار سیدھی کے بجائے لہراتی ہوئی بننے لگی۔ اچانک رام لعل کی نظر کونے پر پڑی ڈریسنگ گائون کی ڈوری پہ گئی جو ہوا سے نیچے گر گئی تھی۔ گری ڈوری ایسی لگتی تھی کہ پتلا سانپ کندلی مارے بیٹھا ہو۔ رام لعل سمجھ گیا کہ اسے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ اگلے روز رام لعل بذریعہ ریل سیٹلا سٹ گیا اور اپنے سکھ دوست سے ملا۔ رنجیت سکھ بھی اس کی طرح طالب علم تھا لیکن اس کے والدین دولت مند تھے اور اسے ماہانہ اچھی رقم اخراجات کے لیے بھیجتے۔ رام لعل نے اس سے کہا کہ مجھے گھر سے اطلاع ملی ہے، میرے والد بسز مرگ پر ہیں۔ میں سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے واپس ہندوستان جانا ہوگا۔ رنجیت سکھ نے کہا کہ ہاں یہی روایت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بڑا بیٹا اس کے پاس ہو۔ رام لعل نے کہا، میرا مسئلہ ہوائی سفر کے ٹکٹ کا ہے۔ میں کام بھی کر رہا ہوں لیکن میرے پاس کافی پیسے نہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم احوار دے دو گے؟ میں ذلہ کام کر کے تمھاری رقم لوٹا دوں گا۔ سکھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں کل بینک سے رقم نکلا کر تمھیں دے دوں گا۔ اس روز شام کو رام لعل اپنے ٹھیکیدار مسٹر میکوش سے ملا اور اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے۔



میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا مذہبی طریقہ ہے کہ مرنے والے کی آخری رسوم اس کا بڑا بیٹا ادا کرے۔ رام لعل نے یہ بھی کہا ”میں نے ہوائی کرائے کی رقم دوست سے احوار لی ہے۔ اگر میں کل کی پرواز سے روانہ ہو جاؤں تو اگلے

منصوبہ کے مطابق تمہیں کام کرنے کے بعد مر جانا تھا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تم مر جاؤ گے۔ بغیر مادہ کے تمہاری نسل آگے نہیں چل سکتی کیونکہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پائے جاتے۔

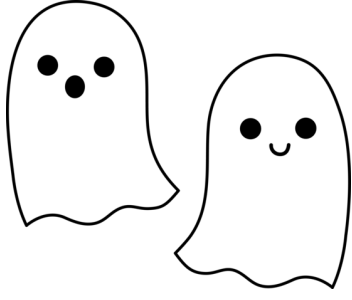


سے ہنسنے لگے۔ رام لعل نے ان سے کہا: ”یقین کرو، یہ انتہائی زہریلا سانپ ہے۔“ بل کیرون کی آنکھوں میں ہنسنے ہنسنے آنسو آگئے۔ وہ رام لعل سے کہنے لگا: ”کالے آدمی، تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔“ بگ بلی ہنسنے ہنسنے کچھ تھک گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کھاس پر لیٹ گیا کہ چند منٹ آرام کر لے۔ تب اسے معمولی چپیں کا بھی احساس نہیں ہوا اس کی داہنی کلائی پر سوئی کی نوک کے برابر دو انتہائی باریک سوراخ ہو چکے تھے۔ کھانا ختم ہو چکا تھا سب لوگ کام کے لیے اٹھ گئے۔ عمارت توڑنے کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سارا ملہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ دو گھنٹے بعد بل کیرون نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، اسے کچھ پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تھوڑا ہاتھ سے رکھا اور اپنے ساتھی سے کہا ”میری طبیعت کچھ خشک نہیں لگ رہی۔ میں ذرا دیر سایہ میں آرام کر لیتا ہوں۔“ پھر وہ درخت کے نیچے بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ پیٹھے پیٹھے اس کے پورے جسم کو جھکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ کر گرلا۔ سب سے پہلے برنس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بیٹرس کو آواز دی اور کہا: ”بگ بلی بہت بیمار لگ رہا ہے۔ میری بات کا اس نے جواب بھی نہیں دیا۔“ سب مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور اس درخت کے پاس آگئے جہاں بل کیرون زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بیٹرس نے رام لعل کو آواز دی کہ ابھر آؤ اور اسے دیکھو۔ تم طب کے طالب علم ہو، تمہارا کیا خیال ہے؟ رام لعل کو کسی معاینے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے جھک کر نبض دیکھی اور بیٹرس سے کہا کہ یہ تو مر چکا۔ بیٹرس نے کہا ”سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ایبولینس بلاتا اور ٹھیکیدار میکیون کو بھی مطلع کرتا ہوں۔“ وہ پھر پیپل سڑک کی طرف روانہ ہوا تاکہ ہاتھ سے فون کر سکے۔ ایبولینس کے پیچھے پڑے بل کیرون کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور بتایا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کی موت واقع ہو چکی۔ میکیون بھی پریشانی کے عالم میں ہسپتال پہنچ گیا۔ پولیس اور عدالتی کارروائی میں چند روز لگے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بل کیرون کی موت قدرتی طور پر ہوئی۔ وجہ دماغ میں شدید اخراج خون تھا۔ عیسائی مذہب کے طریقے کے مطابق تدفین ہوئی جس میں اس کے خاندان، میکیون اور دیگر ساتھی بھی شریک ہوئے۔ رام لعل نے تدفین میں شرکت نہیں کی بلکہ وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ کھاس میں کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کچھ کہنے لگا ”اے زہریلے سانپ! کیا تم میری بات سن سکتے ہو۔ تم نے وہ کام کر دکھایا جس کے لیے تمہیں راجستھان کی پہاڑیوں سے یہاں لایا گیا تھا۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ میرے

تو لانا۔ وہ لماری سے نکال کر لائی۔ بل نے کہا: ”اے دروازے کے پیچھے ٹانگ دو۔ میں ابھی لیتا ہوں۔“ جب بلی نے جیکٹ ناگی تو وہ پھسل کر باورچی خانے کے فرش پر گر پڑی۔ بلی نے غصے سے کہا ”تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ جیکٹ اٹھا کر اچھی طرح ناگو۔“ ”ہا، یہ آپ کی جیکٹ سے کیا چیز گری۔“ بگ بلی کی بیوی، بیٹے اور سب نے اس طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جاندار فرش پر پڑا چمکیلی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ باریک دو شاخہ زبان لہرائی نظر آ رہی تھی۔ بل کی بیوی بولی ”خدا ہمیں محفوظ رکھے، یہ تو کوئی سانپ ہے۔“ بل کیرون غصے سے بولا: ”پاگل نہ ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آئرلینڈ میں قدرتی طور پر کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔“ پھر اس نے بیٹے سے پوچھا: ”بوی، تم تو اسکول میں سائنس پڑھتے ہو، تمہارے خیال میں یہ کیا چیز ہے۔“ لڑکے نے سانپ کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: ”یہ یقیناً کچھو ہے جو عموماً جنگل کی گھاس میں پایا جاتا ہے۔“ بگ بلی نے اپنے بیٹے سے کہا: ”یہ جو کچھ بھی ہے، اسے مار کر باہر پھینک دو۔“ بوی اٹھا اور اپنا جوتا نکال کر اس جانور کو مارنے چلا۔ بل کیرون کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا: ”ذرا رک جاؤ اور مجھے ایک ڈسکن والا مرتبان دو۔“ مرتبان آیا تو بلی اٹھا اور بہت احتیاط اور پھرتی سے سانپ کو مرتبان میں منتقل کر دیا۔ سانپ بھی آئرلینڈ کے سرد موسم سے کچھ ست ہو گیا تھا۔ بلی کے بیٹے نے پوچھا: ”ابو آپ اس کا کیا کریں گے؟“ بلی نے کہا: ”ہمارے گروہ میں ایک کالا بھارت سے آیا ہے، وہاں بہت سانپ ہوتے ہیں۔ میں ذرا اس کے ساتھ مذاق کروں گا۔ وہ تو شاید خوف کے مارے مر ہی جائے گا۔“ اس نے جیکٹ پہنی، کھانا لیا اور بیگ میں پھر سانپ والے مرتبان کے ساتھ رکھ کر پھر وہ اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں سب لوگ مع رام لعل موجود تھے۔ ٹرک میں سوار ہو کر یہ پلانی کام والی جگہ پر روانہ ہو گئی۔ وہاں کام شروع ہونے سے پہلے چائے کے دوران بل کیرون نے پچھلے چپکے دیگر لوگوں کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کالے کے ساتھ کیا مذاق کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ یہ ایک بے ضرر کیزا ہے، رام لعل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لہذا ایسے مذاق میں کوئی حرج نہیں۔ کھانے کے وقفے میں سب لوگ حسب معمول دائرے کی شکل میں بیٹھے۔ رام لعل نے کچھ خیال نہ کیا لیکن باقی لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے اپنا لٹچ ہاکس گھٹوں پر رکھا اور اسے کھولا۔ سینڈویچ اور سیب کے ساتھ چھوٹا سا کٹلی مارے بیٹھا تھا۔ رام لعل کی زبردست توجہ سے علاقہ گونج اٹھا اور ساتھ ہی سب مزدور بے ساختہ زور دار تھپتھپے لگنے لگے۔ رام لعل نے گھبرا کر اپنا لٹچ ہاکس زور سے ہوا میں اچھال دیا۔ سانپ اور سینڈویچ تمام چیزیں چاروں طرف گھاس میں گر پڑیں۔ رام لعل چیختے ہوئے کھڑا ہو گیا اور بولا ”یہ سانپ بہت زہریلا اور خطرناک ہے۔“ سب لوگ پھر

ہیں ، بر فباری اور کھرے کے سبب ان کی حالت خراب ہے، شاید کوئی حصہ ٹوٹ گیا ہو۔ اگلی صبح گم شدہ روح کا مجسمہ اپنی جگہ موجود نہ پا کر کبوتروں نے اطمینان کا سانس لیا انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں کسی اور فرشتے کا مجسمہ نصب کیا جائے گا، گم شدہ روح کے مجسمے کو کسی نے قور کر باہر پھینک دیا تھا۔

§§§



یہ موسم کی تبدیلی تھی یا طوفانی بادلوں کا اثر یا کوئی وجہ تھی کہ بد صورت پتھر کی تختی اور اس کی شکل میں خوشگوار تبدیلی آ رہی تھی۔ گرجا گھر کی چھت پر خوبصورت نئے سناتے پرندے کی آواز سب کو پسند تھی مگر وہ اس پر افسوس کرتے یہ آواز ہمیشہ رہنے والی نہیں، یہ خوبصورت گیت ختم ہو جائیں گے اور گرجا گھر کی دیواریں معصوم پرندے کو بھول جائیں گی۔ گرجا گھر کے کنبیوں نے ایک دن معصوم پرندے کو پتھرے میں قید کر کے گرجا گھر کے باہر فروخت کرنے کے لیے رکھ دیا تاکہ کچھ معاشی فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ وہ رات معصوم پرندے پر بہت بھاری تھی، جو اس نے اپنے ٹھکانے سے دور گزاری۔ باہر بد صورت پتھر پریشان ہوا کہ پرندہ واپس کیوں نہیں آیا، اس نے سوچا شاید اسے ملی کھاگئی ہے یا پھر کسی نے پتھر مار کے زخمی کر دیا ہے، مہمان پرندے کے بغیر گم شدہ روح کے بد صورت مجسمے کو پہلی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔

صبح سویرے جب گرجا گھر کی چڑیوں کا شور اٹھا اور لوگوں کی چہل پہل شروع ہوئی تو اسے معصوم پرندہ بہت یاد آیا، جب کبوتر گرجا گھر کو اونچی دیواروں کے کناروں پر بیٹھتے اور چڑیاں چہکتیں تو اس کے کانوں میں معصوم پرندے کے گیت گونجتے لگتے۔

گم شدہ روح کا مجسمہ بہت اُداس اور غمزدہ تھا۔ کبوتر کھاتے وقت ہمیشہ اس معصوم پرندے کا ذکر کرتے اور کہتے کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ شدید سردی کے ایک دن اور کبوتر چڑیوں کے ساتھ گرجا گھر کی چھت خوراک کے لیے پریشان بیٹھے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی اپنا بچا ہوا کھانا چھت پر پھینکے تاکہ ان کی بھوک مٹ سکے، وہ اکثر سردیوں میں اسی طرح گزارہ کرتے تھے، اس دوران میں ایک کبوتر نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ کیا پکڑے کے ڈھیر پر کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، جواب میں کبوتر کو بتایا گیا کہ نہیں، وہاں صرف ایک مردہ پرندے کو پھینکا گیا ہے۔

رات گئے گرجا گھر کی چھت پر کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مذہبی رسومات کے انچارج کو اسے نے کہا کہ گرجا گھر کے کنارے ملاحوں سے موسم سرما کی شدت برداشت کر رہے

بھوت

مصنف: یوسف

قدیم گرجا گھر کی اونچی اونچی دیواروں پر بہت سے تراشیدہ پتھر رکھے ہوئے، ان میں سے کچھ فرشتوں کے مجسمے تھے، کچھ پادریوں اور بادشاہوں کے اور کچھ پاکیزہ شخصیات کے۔ گرجا گھر کے ایک کونے میں ایک بدرنگ اور بے ڈھنگا پتھر پڑا تھا، جس پر نہ کوئی تاج بنا ہوا تھا، نہ ہی اس کی کوئی شکل و صورت سمجھ آ رہی تھی۔ گرجا گھر میں رہنے والے موٹے ٹیلے کبوتروں نے سمجھا کہ شاید کوئی بھوت ہے مگر مذہبی رسومات کے انچارج کو اسے نے انہیں بتایا کہ یہ ایک گم شدہ روح ہے۔ سردیوں کا کوئی دن تھا، گرجا گھر کے چھت پر ایک سریلی آواز والے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، جو سخت سردی کے باعث دھوپ تلاش کرتا ہوا گرجا گھر کی باڑ پر آہٹا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معصوم پرندہ ایک فرشتے کے مجسمے پر آہٹا، وہ چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد یہاں گھومنا بنالے۔



گرجا گھر میں موجود چڑیوں اور کبوتروں نے اسے وہاں رہنے سے روک دیا اور اس قدر شور مچایا کہ اسے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ معصوم پرندہ وہاں سے الکر، گم شدہ روح کی تصویر والے بد صورت پتھر پر جا بیٹھا اور اسے ہی پناہ گاہ بنالیا۔ گرجا گھر کے کبوتر اس پتھر کو محفوظ جگہ نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ ایک تو وہ گمنام سے کونے میں پڑا تھا دوسرا اس پر ہر وقت گہرا سایہ موجود رہتا تھا۔ گم شدہ روح کا مجسمہ اگرچہ بدرنگ تھا اور اس کے پاؤ اس طرح کٹے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے دشمن کو لٹا رہا ہو، لیکن اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی، معصوم پرندہ وہیں رہنے لگا۔ وہ روزانہ خاموش مجسمے کے اوپر چڑھ جاتا اور خوابوں میں کھوئے دوسرے مجسموں کو دیکھتا رہتا، معصوم اور کمزور پرندے کے لیے یہ واحد محفوظ پناہ گاہ تھی اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا،

روزانہ وقفے وقفے سے مجسمے کے اوپر بیٹھتا، کبھی قریبی ستون پر چڑھ جاتا اور مجسمے کی محبت اور پناہ دینے کے لیے شکر یہ کے طور پر گیت گاتا رہتا۔ یہ بد صورت پتھر کے لیے خوشی کے دن تھے کیونکہ اس کا مہمان پرندہ روزانہ وہاں پہنچتا، ہر روز سریلی آواز میں گیت گاتا، شام کو گرجا گھر کی گھنٹی بجتی تو چگاڑو دینگے ہوئے آہستگی سے اپنے گھروں سے نکل آتے اور پرندہ گیت گاتا رہتا۔

ترقی

مصنف: یوسف



جب کمائی بڑھنے لگی تو جھرو کی بیوی جھیلی کے دل میں لالچ پیدا ہوا اور وہ کمائی کے پیسوں میں سے کچھ پیسے الگ نکال کر اپنے اور اپنے بچوں کا شوق پورا کرنے لگی اور منگو کی بیوی بیلا اور اس کے بچوں سے مجید بھاء کرنے لگی۔ بیلا اس کی ان حرکتوں کو سمجھ گئی، جھیلی فضول خرچ اور لالچی تھی وہ چالاک سے اپنے داؤ پیچ چلاتی جب کہ بیلا سمجھ دار اور اچھی عادتوں کی مالک تھی۔ ایک دن بیلا نے جھیلی سے کہا کہ کیوں نہ ہم دونوں اپنا کام الگ الگ کریں اور اپنی اپنی کمائی بھی اپنے پاس رکھیں جھیلی کو یہ بات پسند آئی اور وہ مان گئی۔

کچھ دنوں بعد جھرو اور منگو بھی اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ الگ رہنے لگے۔ جھیلی کی لالچی طبیعت اور فضول خرچی کی خراب عادتوں کی وجہ سے جھرو اور اس کے خاندان کے لوگ پریشان رہنے لگے۔ جب کہ بیلا کی سمجھ داری اور کفایت شعاری سے منگو ترقی کرنے لگا۔ بیلا تھی تو سمجھ دار لیکن پڑھی لکھی نہیں تھی اس نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور منگو کو بھی سمجھایا کہ علم سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، جب جاگے تب سویرا، منگو نے بھی پڑھنا سیکھ لیا اور ترقی کرتے ہوئے اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلائی آج منگو اور بیلا کے بچے ڈاکٹر اور انجینئر بن گئے ہیں، جب کہ جھرو اور جھیلی اپنی خود کی حرکتوں سے گاؤں سے بھی نچلے درجے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ ہوا یوں کہ اس دوران جھیلی بھی مر گئی۔

یہ بات منگو کو پسند نہ آئی کہ اس کا دوست جھرو اس طرح پریشان رہے اس نے بڑھ کر اپنے دوست کی مدد کی اور اس کے بچوں کی تعلیم کے لیے اچھا انتظام کیا اور نائٹ اسکول میں ان کا داخلہ کراویا۔ دھیرے دھیرے ایک دوست کی مدد سے دوسرا دوست بھی ترقی کرنے لگا۔ اب جھرو کے بچے بھی ٹیچر بن کر محنت سے پڑھانے کا کام کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ فضول خرچی سے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے جب کہ کفایت شعاری سے ترقی ہوتی ہے۔

§§§



یہ دونوں کبھی بھی گاؤں سے باہر نہیں گئے تھے۔ اس لیے شہر جانے سے ڈرتے تھے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب کی بار گاؤں کی جاترا میں جب شہر کے لوگ آئیں گے تو ہم دونوں ان کے ساتھ شہر چلے جائیں گے۔

جھرو اور منگو شہر آگئے۔ شہر کی چکا چوندھ سے وہ ہموچکے رہے گئے۔ کام کی تلاش میں دونوں کئی دنوں تک بھٹکتے رہے وہ جہاں بھی کام کی تلاش میں جاتے تو لوگ ان کے بارے میں پوچھتے اور کیا کام کر سکتے ہو یہ پوچھتے۔ وہ دونوں شہر کے لوگوں کے سامنے کچھ ڈھنگ سے بول بھی نہیں پاتے تھے۔ اور لوگ انھیں دھتکار کر اپنے پاس سے بھگا دیتے۔

ایک دن ہمت کر کے کام ڈھونڈنے نکلے تو اناج کے گودام میں کام مل گیا۔ کام تھانان کی بوریاں ڈھونا، جھرو اور منگو محنتی تو تھے ہی، اپنی محنت اور لگن سے کام کرنے لگے اب دھیرے دھیرے ان کی تکلیفیں دور ہونے لگیں۔ جھرو اور منگو اپنی کمائی کے پیسے اکٹھے ہی رکھتے اور تھوڑی بہت بچت بھی کرتے۔ دن گذرتے گئے اب ان کے رہنے کا مسئلہ بھی دور ہو گیا، انھوں نے کرایہ پر ایک کمرہ لے لیا اور گاؤں جا کر اپنے اپنے خاندان کو شہر لے آئے دونوں کی بیویاں جھیلی اور بیلا بھی کام کرنے لگیں اور اپنی کمائی ساتھ ہی رکھنے لگیں ان دونوں کے بچے پڑھنے کے لیے اسکول بھی جانے لگے۔

میں آتا مجھے نہیں گرا سکتے تھے۔“

تو تو کچھ نہیں بولا اور ہنستا رہا۔

اس کے بعد تو تو کہیں سے گیند اٹھا لیا۔ دونوں کچھ دیر گیند سے کھیلتے رہے۔

شام ہو رہی تھی۔ تو تو بولا: ”چیں چو! اب میں گھر جاؤں گا۔ آج تو کھیلتے کھیلتے تھک گیا ہوں۔ ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ آج وہ کچھ دیر بعد مجھے کہیں گھمانے لے جائیں گی۔“

”تو جلدی جاؤ!“ چیں چو بولی۔ ”میں بھی تھک گئی ہوں۔ لیکن کل مجھے ضرور بتانا کہ تم کہاں گھومنے گئے تھے۔“ وہ پھر بولی۔ ”کل میری ماں مجھے کچھ نی چیز کھانے کو دینے والی ہیں مگر مجھے بتایا نہیں ہے۔ دیکھیں کیا دیتی ہیں؟“

تو تو اپنے گھر چل دیا اور چیں چو اپنے گھر۔ دونوں کو الگ الگ سمت جانا تھا۔

جب چیں چو اپنے گھر جاری تھی۔ راستے میں پھدکو بندر ملا۔ وہ درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا۔ چیں چو کو دیکھتے ہی شاخ پر سے بولا: ”کھو کھو... کھو کھو۔“

چیں چو اس سمجھ گئی کہ یہ پھدکو بندر ہے۔

”ارے بھئی! کیا حال ہے؟ بیچے تو آؤ۔“ چیں چو بولی۔ ”کچھ کہنا ہے کیا؟“

”کہنا تو ہے لیکن نہیں کہوں گا۔ آج کل تو تم تو تو کے ساتھ زیادہ کھیلتی ہو۔ میں تو درخت کی شاخ پر اکیلا بیٹھا رہتا ہوں، تم کو تو میرا خیال ہی نہیں رہتا۔“ پھدکو نے شکایت کی۔

”تو تم بھی کھیلا کرو ہمارے ساتھ، بڑے برگد کے پاس آجایا کرو۔ وہیں تو تو آتا ہے ہم تینوں مل جل کر کھیلا کریں گے۔“ چیں چو نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”ہلہ... ہلہ... ہلہ... ہلہ... پھدکو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: ”میں تو۔ تو تو کے ساتھ نہیں کھیلاؤں گا۔ نہ جانے کب وہ مجھے کاٹ لے؟ جب وہ بھونکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بال گرج رہا ہو۔ مجھے تو اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”تم بے کار میں تو تو سے ڈر رہے ہو۔“ چیں چو بولی۔

تین دوست

مصنف: یوسف

چیں چو بلی اور تو تو کتا مل کر کھیل رہے تھے۔ چیں چو نے تو تو کو دھکا مارا۔ تو تو گر پڑا۔ چیں چو تالی بجانے لگی۔ ”گرا دیا، ... گرا دیا...“



تو تو اٹھ گیا۔ اس پر تھوڑی مٹی لگ گئی تھی۔ اس نے مٹی جھلائی اور چیں چو سے بولا: ”میں گراؤں تو کہتا مت کہ گرا دیا۔“ ایسا دھکا ماروں گا کہ تم لڑھکتی چلی جاؤ گی۔“

”تم گرا ہی نہیں سکتے۔“ چیں چو ہنسنے لگی۔

”اچھا...“ ”ہاں!“

”تو تیار ہو جاؤ۔“ چیں چو پچھے گزرا کر کھڑی ہو گئی۔

تو تو جانتا تھا کہ چیں چو پچھے گزرا کر کھڑی ہو جائے گی اور وہ اسے گرانہیں پائے گا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس آیا اور دھکا مارا۔ چیں چو ذرا سی ڈگمگا کر رہ گئی۔

تم میں تو بہت طاقت ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ تم کو نہیں گرا پایا۔“ تو تو بولا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“ اتنا کہہ کر چیں چو آرام سے کھڑی ہو گئی۔ تو تو ہوشیاری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور تیزی سے آکر ایک دھکا مارا۔ چیں چو زور سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔ اب تالی بجانے کی باری تو تو کی تھی وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

چیں چو اور تو تو دونوں بہت کھانڈرے تھے وہ دونوں اس وقت مذاق ہی تو کر رہے تھے۔ چیں چو کھڑی ہو گئی۔ اس نے بھی اپنے جسم پر لگی دھول مٹی جھلائی اور بولی: ”ایسا دھکا دینے سے کیا ہوتا ہے؟ ذرا پھل ہی بول کر دیتے تو سمجھ

”میں بے کار میں نہیں ڈر رہا ہوں۔ بل کہ صحیح معنوں میں ڈر رہا ہوں۔“ پھدکو نے کہا۔ اور پھر سرگوشی کے انداز میں چیں چو کو بولنے لگا کہ: ”میں تو کہوں گا کہ اب تم بھی اس کے ساتھ کھیلا چھوڑ دو۔ نہیں تو وہ کسی دن تمہیں بھی ضرور دھوکا دے گا۔ اور تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھا جائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

”یہ سب سراسر غلط ہے۔“ چیں چو بولی۔

”غلط بات نہیں ہے۔“ پھدکو نے بات کاٹی اور آگے بولا: ”کیا بلی اور کتے کی کبھی دوستی رہ سکتی ہے۔ بلی کتے کو دیکھ کر ہمیشہ ڈرتی رہی ہے۔ کوئی وجہ ہوگی تب ہی تو بلی کتے سے ڈرتی ہے۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے یہ نصیحت کی ہے اب تمہاری مرضی تمہیں اس کے ساتھ کھیلا ہے کیلیا یا مت کیلیا۔ لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا۔“ پھدکو نے پھر سے یہ بات دہرائی کہ: ”وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھا جائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“



”یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بلی اور کتے کی کبھی نہیں نیچتی لیکن یہ سب کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں۔“ چیں چو نے پھدکو سے کہا۔

”اچھا! دوسری مثال بھی سنو۔“ پھدکو بولا: ”شیر اور ہرن میں کبھی دوستی نہیں سٹی گئی۔ جب بھی شیر ہرن کو دیکھتا ہے، وہ اس کو مارنے دوڑتا ہے۔ اگر کچلا لیتا ہے تو وہ ہرن کو ماری ڈالتا ہے۔ اس لیے شیر ہرن کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ اسی طرح بلی اور کتے کا معاملہ ہے۔“

”میں تمہاری اس بات سے اختلاف نہیں کرتی۔“ چیں چو نے کہا۔ اور بولی: ”بل کہ میں ایک مثال اور دیتی ہوں، وہ بھی کسی دوسرے کی نہیں خود اپنی یعنی بلی اور چو ہے کہ بلی چو سے کی دشمن ہے، وہ جہاں کہیں چو ہے کو دیکھتی ہے اس کو مار ڈالتی ہے۔ لیکن کہیں بلی اور چو ہے کی دوستی ہوئی ہے؟ میری اور تو تو کی دوستی کی بات الگ ہے۔“

اب پھدکو خود ہی بولا: ”میں نے ایک دن جیس چو سے کہا تھا کہ تو تو تمہیں کسی دن دھوکا دے گا، اُس کا ساتھ چھوڑ دو۔“

تو تو ہنسا: ”بس اتنی سی بات، اس کے لیے معافی مت مانگو۔ تمہارے دل میں شک تھا سو وہ آج دور ہو گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

تو تو کہنے نے پھدکو بندر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھدکو بندر کا ہاتھ جیس چو ملی نے پکڑ لیا اور تینوں کہتے جارہے تھے ہم تینوں دوست ہیں۔

§§§

دوسرے لڑکے نے کہا۔
اُن لڑکوں کی باتیں جیس چو نے بھی سنا اور تو تو نے بھی۔ تو تو بولا: ”جیس چو! تم نہیں رہو۔ میں ان لڑکوں کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ یہ جیسے ہی غلیل چلانے جائیں گے۔ میں اتنی زور سے بھونکوں گا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ اپنی بھون بھون سے میں انھیں ایسا ڈراؤں گا کہ پھر کبھی بھی وہ لوہر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔“

”شک ہے، لیکن میں بھی آتی ہوں۔ تم جا کر اُن لڑکوں کو ڈراؤ۔“ جیس چو نے کہا۔

لڑکے جلدی سے درخت کے پاس پہنچے۔ ایک لڑکے نے کہا: ”دیکھو میرا نشانہ نکلتا صبح ہے میں غلیل چلاؤں گا تو میرا ڈھیلا سیدھا بندر کے سر پر لگے گا۔“

تو تو کے قریب آکر جیس چو بھی کھڑی ہو گئی۔ پھدکو بندر درخت پر سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کو غلیل مارنے والا ہے۔ اُس نے سوچ لیا کہ جیسے ہی وہ لڑکا غلیل چلائے گا وہ چھلانگ لگا کر دوسری شاخ پر چلا جائے گا۔

لڑکے نے جیسے ہی غلیل سے نشانہ لگایا۔ تو تو نے ایسی زور سے بھون بھون بھونکہ کہ وہ بُری طرح ڈر گئے اور غلیل وہیں پھینک کر دو گیارہ ہو گئے۔ پھدکو نے دیکھا کہ لڑکے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو تو تو نے ذرا کر بھگایا ہے۔

اب پھدکو بڑا شرمندہ ہوا۔ کہیں ڈھیلا اسے لگ جاتا تو؟ تو تو نے شرارتی لڑکوں کو بھگا کر اُس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

پھدکو شاخ سے کود کر نیچے آیا اور تو تو سے بولا: ”بھیا! مجھے معاف کر دینا۔“

”کس بات کے لیے؟“ تو تو نے انہماں بن کر پوچھا۔ ”کیا جیس چو دیدی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ پھدکو نے کہا۔

”نہیں مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔“ تو تو بولا اور جیس چو سے پوچھا: ”کیا بات ہے جیس چو؟“

”کچھ نہیں کوئی بات نہیں ہے۔“ جیس چو بولی۔ وہ تو تو کو کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں پھدکو اور تو تو میں دراز پڑ جائے۔

”میں نے جو سمجھا وہ تمہیں بتا دیا۔“ پھدکو بولا۔ ”تم میری اچھی دوست ہو۔ اس لیے تم کو بتا دیا، نصیحت کر دی، اب تمہاری مرضی تم میری بات مانو یا نہ مانو، لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا۔“ پھدکو نے پر سے یہ بات دہرائی کہ: ”وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھا جائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

جیس چو کو پھدکو کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ یہ تو کسی کی برائی بیان کرنا ہوا، غیبت کرنا ہوا۔ برائی اور غیبت تو دشمن کی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ غیبت کرنا یا کسی کی دوستی کو توڑنا یا کسی میں جھگڑا گلوادینا اچھی بات نہیں ہے بل کہ یہ تو سب سے بڑا دھوکا ہے۔ اُس نے یہ باتیں پھدکو سے نہ کہی بل کہ من ہی من میں سوچتے ہوئے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔



جیس چو اور تو تو ہمیشہ کی طرح کھیلتے رہے، ہنستے بولتے، گاتے رہے۔ جیس چو روز پھدکو کو کھیلنے کے لیے بلاتی رہی لیکن وہ بار بار بلانے کے باوجود بھی کبھی ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ تو تو اُسے کاٹ لے گا، وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ بل کہ وہ جیس چو سے اکثر کہتا کہ: ”وہ کسی دن تمہیں دھوکا دے سکتا ہے وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھا جائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

وقت گذرتا رہا کہ ایک دن جھاڑی کے قریب سے چند لڑکے جارہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں غلیلیں تھیں، وہ صورت شکل سے ہی بڑے شرارتی لگ رہے تھے۔ جیس چو اور تو تو جہاں کھیل رہے تھے وہ لڑکے وہیں سے گزرے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا: ”میرا نشانہ ایسا پکا ہے کہ جس کو غلیل ماروں وہ بچ ہی نہیں سکتا۔ میں اڑتے ہوئے پرندے کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔“

”تو جلیں بندر کو غلیل ماریں۔“ ایک لڑکے نے کہا۔ ”وہ دیکھو! بندر شاخ پر بیٹھا ہے۔“

”ہاں دیکھیں! کس کا نشانہ صحیح بیٹھا ہے؟“ ایک

ہائی ٹیک

مصنف: یوسف

چارلی چپلن ایک لیجنڈ آرٹس تھا اس نے بہت کم عرصے میں اپنی سوچ اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت کچھ پروڈیوس کرنے کے بعد دکھا دیا کہ دنیا میں ہر طرح کے انسان بستے ہیں اس کی کامیڈی فلمیں صرف انٹرٹینمنٹ ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی تھیں اسکی نقالی آج بھی دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔ تھیٹر، سٹیج شو، سنیما اور ٹیلی ویژن نے نیا ٹریڈ لا کر دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ آج بھی کئی لوگ ان چیزوں سے شدید نفرت کرتے اور آرٹسٹوں کو میراثی اور سنگج وغیرہ کہتے ہیں حالانکہ آرٹسٹ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں انسان ہونے کے ساتھ اپنے اندر جذبات اور احساسات کا سمندر رکھتے ہیں اور آرٹسٹ سے نفرت کرنا انسانیت سے نفرت کرنے کے مترادف ہے۔ کئی برسوں تک سنیما میں اگرچہ ہر دور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا دکھایا جاتا اور شائقین محفوظ ہوتے لیکن ٹی وی آنے کے بعد انسانوں کی سوچ یکسر بدل گئی کیونکہ چھوٹی سکرین پر ایڈورٹائزنگ کی بدولت دنیا کی ہر اچھی اور بری شے نشر کی جانے لگی ایک طرف اگر معلومات کا خزانہ ہو تو دوسری طرف کئی انسانوں کے لئے منفی بھی ثابت ہوتی ہیں



ساتھ اور سڑ کی دہائی میں ٹی وی پر ہر نئی شے کو دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر یہ ہوتا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے وغیرہ۔ بات کچھ عجیب سی ہے کہ کچھ لوگ سائنسی ایجادات کو مانتے ہوئے عیش عیش کرتے ہیں ایجادات سے مستفید ہوتے ہیں اور پھر اسے برا بھی سمجھتے ہیں۔ سائنس اگرچہ خود ترقی نہیں کرتی بلکہ انسان اپنے دماغ اور سوچ کو بروئے کار لا کر اس کھوج میں رہتا ہے کہ کچھ نیا ایجاد کیا جائے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہر انسان ایک سائنس دان ہے یعنی اسکا دماغ اتنا فاسٹ ہے کہ وہ چاہے تو ہر سیکنڈ میں نئی سوچ سے دنیا تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن افسوس کہ کچھ لوگ اپنا دماغ استعمال کرتے ہیں اور کچھ جانتے ہی نہیں کہ دماغ آخر ہوتا کیا ہے۔ مستقبل قریب یعنی دو ہزار سچیں تک سائنسی دنیا میں نیا انقلاب آجائے گا آنے والے سات آٹھ برسوں کے اندر ہم کئی پرانی اشیاء سے محروم ہو جائیں گے اور یہ اشیاء ماضی کا حصہ کہلاتے ہوئے اینٹک شمار کی جائیں گی جیسے کہ آج کل ٹرانزسٹر یا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے آج کی جراثیمیں نہیں جانتی کہ کیسٹ ریکارڈر کیا ہوتا ہے۔ ہائی ٹیک یعنی ہائی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں سپید پکڑ چکی ہے اور ہر انسان کی ضرورت بھی بن گئی ہے کیونکہ جتنی تیزی سے سائنس ترقی کر رہی ہے انسان کیلئے سہولت پیدا ہو رہی ہے اتنی تیز رفتاری سے انسان ست اور کٹا ہوتا جا رہا ہے۔ لیکویڈ کرسٹل ڈسپلے جنہیں ایل سی ڈی ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر اپنی مخصوص بناوٹ سے دنیا بھر میں مقام حاصل کر چکے ہیں اور موٹی فونڈ والے ٹی وی کو کچرے کے ڈبے یعنی ری سائیکلنگ کمپنیز کو واپس کر دیا گیا ہے آج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں کیونکہ ایل سی ڈی ٹی وی بہت پتلے یعنی سمارٹ ہونے کے ساتھ بہت کم جگہ لیتے اور آج کل بہت ارزوں قیمت پر دستیاب ہیں اسکے باوجود گزشتہ برس ایل جی کمپنی نے مستقبل کیلئے ایک نیا ٹی وی متعارف کروایا ہے جسے اورگائیک لائٹ اینڈنگ ڈاؤڈ یعنی او ایل ای ڈی کا نام دیا یہ نیا ٹی وی اپنی منفرد لائٹس سے فکشن کرے گا جس سے انرجی کی بچت ہوگی اور آج کل کے فور کے ٹی وی سے زیادہ صاف وشفاف تصویر پیش کرے گا علاوہ ازیں یہ حیرت انگیز ٹی وی کانڈکٹر کی طرف باریک ہونے کیساتھ رول اور فولڈ کیا جاسکے گا کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے اس ڈیڈیو سیریز یعنی وال پیپرز کی موٹائی اندازً دو سے تین ملی میٹر ہوگی متنطبیسی سسٹم سے دیوار میں ایڈجسٹ کیا جاسکے گا عام استعمال کے لئے اس سال کے آخر میں مارکیٹ میں دستیاب ہو گا۔ لیڈ لیپ۔ عام بلب یا انرجی سیور لیپس بہت جلد مارکیٹ سے ہٹا دئے جائیں گے انکی جگہ پر کرنے کیلئے او لیڈ لیپ دستیاب ہونگے ان سنے لیپ کا موازنہ ایل جی کے ٹی وی سسٹم سے کیا جا سکتا ہے معروف کمپنیز فلیس اور اوسرام بہت جلد یہ لیپ متعارف کروائیں گی۔ سٹورج میڈیا۔ آج کل سی ڈیز، ڈی وی ڈیز، ڈسک کے علاوہ یو ایس بی سٹکس پر تمام ڈیٹا منتقل کرنے کے بعد سٹورج کیا جاتا ہے جبکہ آنے والے برسوں میں یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا اور اسکی جگہ بوکس، اینڈرون اور گوگل کمپنیز ایک نیا سٹورج میڈیا متعارف کروائیں گے جس میں وائی فائی سسٹم کے تحت آن لائن ڈیٹا سٹور کیا جا سکے گا۔ گیم کونزولز۔ گیمز کھیلنے والے یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کنزولر یا دیگر کونزولز کے بغیر اپنی من پسند گیم ایکس بوکس یا پلے سٹیشن پر کھیل سکیں لیکن مستقبل قریب میں این وائی ڈیٹا کمپنی کونزولز فری کلاؤڈ گیم سسٹم متعارف کروائے گی جس سے گیمز کھیلی جائیں گی یہ کمپنی جی فورس ناؤ گیم سٹریمنگ سروس کے ذریعے گیم کھیلنے والوں کیلئے سہولت پیدا کرے گی علاوہ ازیں اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ سسٹم کو بھی ریموٹ سرور کے ذریعے ہائی ٹیک طریقے سے استعمال کیا جا سکے گا۔ کیبل چارجز۔ سیمٹک کمپنی نے حال ہی میں کیبل فری چارجز متعارف کروایا ہے ایک مخصوص پیڈ کے ذریعے سمارٹ فونز، لیپ ٹاپ اور دیگر الیکٹرونک انسٹرومنٹس چارج کئے جا سکیں گے، پلگ یا ایڈیٹرز کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی، اپیل کمپنی نے بھی کیبل فری ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی ہے جس سے تمام آلات کیبل کے بغیر چارج کئے جائیں گے۔ ریموٹ کنزولز۔ پروگرامنگ

اور دیگر فنکشن کے لئے ریوٹ کنٹرول کی بجائے وائس سسٹم سے تمام آلات فنکشن کریں گے اس سسٹم کیلئے سینسور استعمال کیا جائے گا مثلاً ایکس بوکس یا پلے سٹیشن کو ٹی وی کے والیم سے منسلک کرنے کے بعد وائس کنٹرول سے استعمال کیا جاسکے گا۔ پلاسٹک کارڈز اور پاس ورڈز سسٹم بھی جلد ختم کرنے کے بعد تمام ڈیٹا سمارٹ فونز پر منتقل کرنے سے ہر قسم کی شاپنگ کی جاسکے گی ہائیو میٹرک سینسر اور ہائی ٹیک الفا بیلک سسٹم کے علاوہ فنگر پرنٹس اور چہرے کی شناخت سے تمام عوامل باآسانی ملے پائیں گے۔ انسان ایک طرف کہتا ہے کہ سائنس ترقی کر رہی ہے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسری طرف سائنسدانوں کو برا بھلا بھی کہا جاتا ہے۔ چارلی چیپن آج زندہ ہوتا تو بہترین ایکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سائنسدان بھی ہوتا جو ہستے ہستے بہت کچھ دریافت کرتا اور لوگ اس کی تعریف بھی کرتے۔

بہتر گھر

مصنف: یوسف

ایک شخص نے بہتر گھر خریدنے کیلئے اپنا پہلے والا گھر بیچنا چاہا۔

اس مقصد کیلئے وہ اپنے ایک ایسے دوست کے پاس گیا جو جائیداد کی خرید و فروخت میں اچھی شہرت رکھتا تھا۔

اس شخص نے اپنے دوست کو مدعا سنانے کے بعد کہا کہ وہ اس کے لئے گھر برائے فروخت کا ایک اشتہار لکھ دے۔

اس کا دوست اس گھر کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اشتہار کی تحریر میں اُس نے گھر کے محل وقوع، رقبے، ڈیزائن، تعمیراتی مواد، باغیچے، سونگ پول سمیت ہر خوبی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

اعلان مکمل ہونے پر اُس نے اپنے دوست کو یہ اشتہار پڑھ کر سُنا یا تاکہ تحریر پر اُسکی رائے لے سکے۔

... اشتہار کی تحریر سن کر اُس شخص نے کہا، برائے مہربانی اس اشتہار کو ذرا دوبارہ پڑھنا اور اُس کے دوست نے اشتہار دوبارہ پڑھ کر سُنا دیا۔

اشتہار کی تحریر کو دوبارہ سن کر یہ شخص تقریباً چیخ ہی پڑا کہ کیا میں ایسے شاندار گھر میں رہتا ہوں؟

اور میں ساری زندگی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھتا رہا جس میں کچھ ایسی ہی خوبیاں ہوں۔ مگر یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں تو رہ ہی ایسے گھر میں رہا ہوں جس کی ایسی خوبیاں تم بیان کر رہے ہو۔ مہربانی کر کے اس اشتہار کو ضائع کر دو، میرا گھر بکاؤ ہی نہیں ہے۔

ایک بہت پرانی کہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کو ایک کانڈ پر لکھنا شروع کر دو، یقیناً اس لکھائی کے بعد تمہاری زندگی اور زیادہ خوش و خرم ہو جائے گی۔

اصل میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا ہی بھلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ جو کچھ برکتیں اور نعمتیں ہم پر برس رہی ہیں ہم ان کو گننا ہی نہیں چاہتے۔

ہم تو صرف اپنی گئی جتنی چند پریشانیاں یا کمی اور کوتاہیاں دیکھتے ہیں اور برکتوں اور نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

کسی نے کہا: ہم شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ نے پھولوں کے نیچے کانٹے لگا دیئے ہیں۔ ہونا یوں چیلئے تھا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اُس نے کانٹوں کے اوپر بھی پھول اگا دیئے ہیں۔

ایک اور نے کہا: میں اپنے شکوے پیروں کو دیکھ کر کڑھتا رہا، پھر ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو شکر کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔

اب آپ سے سوال

کتنے ایسے لوگ ہیں جو آپ جیسا گھر، گاڑی، ٹیلیفون، تعلیمی سند، نوکری وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں؟

کتنے ایسے لوگ ہیں جب آپ اپنی گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے ہو تو وہ سڑک پر شکوے پاؤں یا پیدل جا رہے ہوتے ہیں؟

کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پر چھت نہیں ہوتی جب آپ اپنے گھر میں محفوظ آرام سے سو رہے ہوتے ہیں؟

کتنے ایسے لوگ ہیں جو علم حاصل کرنا چاہتے تھے اور نا کر سکے اور تمہارے پاس تعلیم کی سند موجود ہے؟

کتنے بے روزگار شخص ہیں جو فاقہ کشی کرتے ہیں اور آپ کے پاس ملازمت اور منصب موجود ہے؟

اور وغیرہ وغیرہ ہزاروں باتیں لکھی اور کہی جاسکتی ہیں۔۔۔۔۔

کیا خیال ہے ابھی بھی اللہ کی نعمتوں کے اعتراف اور اُکا شکر ادا کرنے کا وقت نہیں آیا کہ ہم کہہ دیں

یا رب لک الحمد کما ینبغی لجلال وجسک وعظیم سلطانتک

اللہم لک الحمد حتی ترضی و لک الحمد إذا رضیت و لک الحمد بعد الرضا

